# ادب کی جمالیات
# زبان کے حوالے سے

پروفیسر نذیر احمد ملک

نطق اور تحریر اظہار زبان یا ترسیل خیالات کے دو اہم طریقے ہیں۔ نطق کا تعلق سماعت کے ساتھ ہے جب کہ تحریر بصارت سے متعلق ہے۔ سماعت میں اصوات کے ذریعے کہی ہوئی بات بیرونی کان سے ٹکرا کر اندرونی کان کے راستے ذہن کے اس گوشے میں پہنچتی ہے جہاں اس کی تفہیم ہوتی ہے۔ بصارت میں حروف یا ترسیمی نشانات کے ذریعے لکھی ہوئی بات آنکھوں کے توسط سے ذہن میں تفہیمی مراحل طے کرتی ہے۔ ترسیل کے یہ دونوں طریقے اصل میں متکلم اور سامع یا مصنف اور قاری کے ذہنوں کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے زبان خالصتاً ایک ذہنی عمل ہے۔ زبان کا مبتدا اور منتہا انسانی ذہن ہے اور اس کا الگ الگ علوم کے تحت مطالعہ بھی کیا جاتا ہے تاہم یہ تمام مراحل زبان کے تفہیمی پہلو کے لیے معاون کردار ادا کرتے ہیں۔

انسانی ذہن کو قدرت نے جہاں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے وہیں ایک اہم صلاحیت زبان کے اظہار اور اس کی تفہیم کی بھی ہے۔ انسانی ذہن کی ساخت زبان کی ساخت کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ اپنے ماحول میں بولی جانے والی زبان کو بغیر کسی رسمی تربیت کے حاصل کرتا ہے۔ اس کے تحصیل کے منازل اور مراحل پر گو کہ کافی تحقیق ہو چکی ہے تاہم اس عمل کو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ ایک طرح کا سالم اور کلیت (Wholistic) کا عمل ہے۔ اس کی وجہ عیاں ہے کہ کسی بھی بچے کو ابتدائی عمر میں اپنی پہلی زبان کو اصوات، الفاظ یا جملوں کے ذریعے نہیں سمجھا یا جاسکتا ہے بلکہ وہ از خود اپنی ذہنی ساخت اور تفہیمی صلاحیت کو بروئے کار لا کر زبان کے بنیادی اصولوں کو دریافت کر کے ذہن نشین کرتا ہے اور ایک قلیل عرصے کے بعد اپنی تفہیمی بنیادوں پر آہستہ آہستہ اظہار خیالات کرنے لگتا ہے۔ مطلب یہ کہ تفہیم اظہار سے پہلے کی منزل ہے لیکن یہ تفہیم بھی اندرونی زبان کی محتاج ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زبان کی ایک ذہنی یا نفسیاتی شکل ہے اور ایک طبعی شکل ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں کیا جاسکتا ہے اگر چہ خیال اور زبان کی دوئی پر بھی کافی کام ہو چکا ہے تاہم اس طرح کی تمام کوششیں ابھی تک لا حاصل ثابت ہوئی ہیں۔

اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ حیوانوں اور جانوروں کے مقابلے میں انسان کی جسمانی نشوونما ذرا دیر سے ہوئی ہے۔ بنی نوع انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی جسمانی اور ادراکی نشوونما ساتھ ساتھ ہوتی ہے یہ بسا اوقات ایک دوسرے کی معاونت سے آگے بڑھتی ہیں۔ حاصل شدہ تمام تر حواس جن کو عرف عام میں عناصر خمسہ بھی کہتے ہیں اس کی ذہنی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنے

اردگرد کے ماحول سے اس کے ذہنی تصادم کو سمجھنا انتہائی کٹھن کام ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے ذہنی اُفق کو وسیع کرتا ہے۔ پھر رسمی اور دنیوی اور دینی علوم کی تحصیل اس کے ذہن کو اور کشادگی سے متصف کرتی ہے۔ بعدازاں زبان کا سماعتی اور بصری پہلو اس کی ذہنی وسعت کا مظہر بن جاتا ہے۔

اپنے ذاتی و اجتماعی تجربات، رسمی غیر رسمی تعلیم و تربیت اور دوسرے مظاہر سے انسان ایک ذہنی ذخیرہ (Mental Storage) قائم کر لیتا ہے۔ چناں چہ یاداشت کی طاقت اسی ذہنی ذخیرے کا سب سے بڑا وصف ہے۔ یہ ذہنی ذخیرہ انتہائی متحرک اور فعال ہوتا ہے۔ اس میں ہر تحصیل شدہ شے سے متعلق مختلف کیفیات بھی جمع رہتی ہیں۔ تاہم کسی بھی تحصیل شدہ شے سے متعلق ہر نیا تجربہ یا مشاہدہ اس سے متعلق پرانی واقفیت کو یا تو تبدیل کرتا ہے یا اس میں اضافہ و ترمیم کرتا ہے۔ یوں یہ سلسلہ ایک نہ رکنے والا عمل بن جاتا ہے اور ہر لمحہ ایک ذہنی ترفع سے آشنا کرتا ہے۔

یہی ذہنی کشادگی، تبدیلی اور ترفع جمالیات کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ جمالیات ایک عالمی تصور ہے۔ انسانی فطرت کے اندر جمالیات کو محسوس کرنے کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ تاہم اس کی کرنیں انسانی ذہن کے فعال کردار سے پھوٹتی ہیں۔ ظاہری خوب صورتی جس کو ہماری آنکھیں دیتی ہیں یا جس کو ہمارے عناصر محسوس کرتے ہیں وہ بھی ردعمل کے لیے ذہن میں چلی جاتی ہیں اور وہیں ان کا ادراک ہوتا ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا ایک جسمانی وجود ہے اور ایک اخلاقی وجود ہے۔ قدرت نے ہمارے اندر اخلاقی وجود کو زیادہ مقدم بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ہر اچھی چیز کو پسند کرتا ہے اور ہر نیک عمل اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن

جاتا ہے تاہم دنیوی رذائل اور خباثت بعض اوقات اس کے اخلاقی وجود پر غالب آجاتے ہیں وہ دنیاوی حرص و ہوس میں گرفتار ہو کر اخلاقی وجود سے دور ہو جاتا ہے لیکن اس کے باطن میں اخلاق کو محسوس کرنے کی قوت ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جمالیات کا تعلق ہمارے اخلاقی وجود سے ہے۔ ہر وہ چیز جو ہمارے اخلاقی وجود کو مس کرتی ہے، جمالیات کے ذیل میں آتی ہے۔

ادب ملفوظی فن ہے۔ دوسرے فنون کے مقابلے میں ادب لفظ کی لسانیات سے تشکیل پاتا ہے۔ یوں تو لفظ کی تعریف ممکن نہیں ہوسکی ہے لیکن اس کے وجود اور اس کی اہمیت سے کسی کو مفر بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے ذہنوں میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ یہ ہمارے ڈسکورسز اور بیانیوں کا جز ولاینفک بن گیا ہے۔ ہر لفظ یا ہر لسانی اکائی کا ایک ہیئتی وجود ہے اور ایک معنیاتی وجود ہے۔ ہیئتی وجود تکلم کی سطح پر اصوات سے تشکیل پاتا ہے اور تحریری سطح پر حروف سے متشکل ہوتا ہے جب کہ معنیاتی وجود اس کے استعمال سے سامنے آتا ہے اگر چہ ہر لفظ کا ایک لغوی معنی بھی ہوتا ہے۔ جب ادبی متن کی بات کی جاتی ہے تو اس کی بھی ایک لسانی ہیئت ہوتی ہے اور ایک ادبی ہیئت۔ جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاتا ہے جس کو عرف عام میں فارم اور فنکشن کا نام دیا گیا ہے۔ ادبی متن فارم اور فنکشن کے ادغام اور انضمام سے نمو پاتا ہے اور یوں ہمارے لیے جمالیاتی انبساط اور تسکین فراہم کرتا ہے۔ آیئے مومنؔ کے اس شعر پر ذرا غور کریں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ظاہر ہے کہ لسانی اعتبار سے یہ شعر گیارہ الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ الفاظ تکلم کی سطح پر اصوات سے ترتیب دیئے گئے ہیں اور تحریری سطح پر حروف پر مشتمل ہیں۔ یہ الفاظ افقی سطح پر ایک خاص ترتیب سے بٹھائے گئے ہیں جو زبان کے مجموعی لفظی سرمائے سے منتخب کیے گئے ہیں۔ یہ الفاظ نحوی سطح پر ایک جملہ سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ ان میں کوئی لفظ ایسا بھی نہیں ہے کہ جس کے معنی کی تلاش کے لیے لغت کا استعمال کرنا پڑے۔ سوال یہ ہے کہ اس شعر میں ایسی کون سی بات ہے جس کی وجہ سے غالب اس کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینا چاہتے تھے اگر یہ روایت مستند ہے۔

ایک حیثیت سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ایک بات یا Utterance کو دو مصرعوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس کی ایک بحر ہے اور وزن ہے اور الف کا قافیہ ہے۔ یہ چیزیں اس کی ظاہری خوب صورتی کو تو دکھاتے ہیں لیکن ان سے اس شعر کی جمالیاتی اثر پذیری سامنے نہیں آتی ہے۔ شاید اسی بنا پر حالؔی نے اچھے شعر کے لیے بحر، وزن اور قافیہ کو غیر ضروری قرار دیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کی شناخت ان ہی پابندیوں کی مرہون منت ہے۔ اس بات سے قطع نظر یہ شعر جن الفاظ پر مشتمل ہے ان کی رفاقت نے دو کرداروں بیان کنندہ اور شنیدہ کنندہ کے درمیان باہمی محبت، شناسائی اور یگانگت کے جذبے کو جس خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ شاید استعارہ بندی اور دوسرے فنی لوازم کے ساتھ بھی ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک کردار جو عاشق بھی ہوسکتا ہے اپنے وجود کی گہرائیوں میں تحلیل ہو کر دیکھتا ہے۔ یہ شعر ''پاس ہونے'' کی معمولی دوری کو بھی معنیاتی سطح پر ختم کر دیتا ہے۔

آیئے اس شعر کے دوسرے معنی کی طرف بھی آئیں۔ اس میں صنعت ایہام کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے لفظ ''گویا'' کے دو معنی ہیں۔ ایک ''ہو بہو'' یا ''جیسے'' کے معنی میں ہے اور دوسرے ''بولنا'' یا ''بات کرنے'' کے ہیں۔ یہ بات مان کر چلیں کہ اس میں عاشق اور معشوق کے کردار ہیں۔ عاشق اپنے معشوق کی حیا پسندی اور محبت کی پاسداری کو محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جلوت میں تم میرے ساتھ بات کرنے سے تو کتراتے ہو لیکن جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا ہے تو میرے ساتھ ہم کلام ہوتے ہو۔ یعنی اوروں کے سامنے میرے تئیں جذبہ محبت کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو۔ یہ اقرار محبت اور اس کی پاسداری نہیں ہے تو کیا ہے۔ شاعر نے صیغۂ وقت سے ماورا ہو کر سامنے کے چند الفاظ وہ بھی ضمائر کی شکل میں ایسی معنوی گہرائی پیدا کی ہے کہ ان لفظوں کی تقدیر ہی بدل گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شعر میں لسانی ہیئت اور ادبی ہیئت مدغم ہو گئی ہے۔

جیسا کہ شروع میں ہی عرض کیا گیا کہ زبان چاہے گفتگو کی صورت میں ہو یا تحریری صورت میں، اس کا اصل اور بنیادی فریضہ ترسیلِ خیالات ہے۔ چناں چہ وہی ترسیل کامیاب قرار دی جاسکتی ہے جس سے سامع یا قاری تفہیم کی سطح پر کوئی معنی و مفہوم اخذ کر سکے اور عمومی طور پر اس ارادے کی شناخت کو بھی ممکن بنا سکے جس کے لیے ترسیل کے اس طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔ معنی و مفہوم کے استنباط کے لیے سیاق کا ہونا بھی ضروری ہے۔ سیاق کی عدم موجودگی کسی بھی طرح کے اخذ معنی میں مشکلات کا اہم سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے زبان اپنے طور پر ایک مکمل اور شفاف میڈیم نہیں ہے۔ زبان کی اپنی کائنات ہے مثلاً سامنے کا آسان سا جملہ لیجیے۔ ''اس نے مجھے کتاب دے دی''۔ اس کے معنی میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور ظاہر میں اس

کے سمجھنے میں کوئی دقت بھی نہیں ہے لیکن اس جملے میں کئی باتیں ایسی ہیں جو صاف نہیں ہیں۔ مثلاً کتاب دینے والا کون ہے؟ اس کا جنس کیا ہے؟ اس نے کون سی کتاب دے دی؟ اپنی کتاب دے دی یا کسی اور کی؟ کیوں سے دی؟ کب دے دی؟ دینے والے کا آپ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں سیاق سے واضح ہو سکتی ہیں لیکن معنیاتی اعتبار سے اس جملے میں ایک اور الجھاؤ بھی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں بلکہ کتاب دینے کے اس ایکٹ کے تئیں آپ کی ذاتی سوچ اور ردعمل کیا ہے یعنی آپ تک اس کتاب کے پہنچانے کا کیا مقصد یا مقاصد ہو سکتے ہیں؟ یعنی Reception کی اہمیت ترسیل (Transmission) سے زیادہ ہے۔

یوں تو ادبی متن کی تفہیم کے لیے بھی سیاق کا سمجھنا ضروری ہے۔ تاہم وہ متن زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے جس میں متن تخلیق کیا گیا ہو بلکہ وہ سیاق اہم ہے جس کے تحت قاری اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ادبی متن کی تفہیم کے لیے سیاق کی فراہمی قاری کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ قاری کا ادراک، علم، تجربہ، مشاہدہ، ذوق، نظریہ وغیرہ متن کی معنی خیزی کی راہیں استوار کرتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یہ شعر راج رام نارائن سے منسوب ہے۔ اس کے پس منظر میں کہا جاتا ہے کہ سرج الدولہ ؒ جب دور مشرق یعنی بنگال میں انگریزوں کے ساتھ سخت ترین مقابلے میں شکست سے دوچار ہو جاتا ہے اور کسی طرح سے گرفتاری سے بچ نکلنے پر کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر گرفتاری کے بعد قتل کیا جاتا ہے تو اس افسوس ناک واقعے سے ان کی رعایا پر کیا گزری ہوگی، اس کا بیان ہے۔ اس کے تاریخی حوالے کی اگر چہ

اپنی اہمیت ہے تاہم یہ شعر سیاق سے آزاد ہے۔ کسی بھی اچھے شعر کو کسی مخصوص سیاق سے وابستہ کرنا اس کی شعری انفرادیت سے اغماض برتنے کے مترادف ہے۔ اچھا شعر سیاق سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہی سیاق اہم ہے جس کے حوالے، پس منظر یا موقع ومحل کے تحت اس کی قرأت کی جائے۔ شعر کی لفظی ترتیب اور انتخاب صرف لسانی بنت اور ظاہری معنی کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ محض اشاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اشاروں کے معنی کی کون سی کائنات آباد ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ غالبؔ کی زبان میں ان کو اندیشہ ہائے دور دراز کا نام دیا جا سکتا ہے اور انگریزی میں Weak Implications کہا جا سکتا ہے یعنی ادب میں سامنے والے معنی کے بجائے ان معنی کے انکشاف کی اہمیت ہے جو ہمارے ذہنوں کو نہ صرف متحرک کر سکے بلکہ ایک طرح سے جمالیاتی ترفع کا باعث بھی بن سکیں۔ جمالیاتی ترفع جذبات کو انگیز کرنے کے بجائے شعور کو انگیخت کرنے کی وجہ بن جانا چاہیے۔ لفظی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو شاعری ''شعور'' سے مطابقت رکھتی ہے۔ انگریزی میں 'Poem' کے معنی بھی شعوری طور پر ترتیب کو دینے کو کہتے ہیں۔ جذبات کو وجود لمحاتی ہوتا ہے جب کہ فکر نہ ٹوٹنے والے سلسلے کا نام ہے۔ عالمی ادب یا معیاری ادب کی شناخت اور تفہیم کا معاملہ بھی فوری جذبات کی تسکین کے بجائے فکری وجود کے اثبات سے منسلک ہوتا ہے۔ دنیائے ادب کے وہی شاعر اور ادیب دیرپا نقش ثبت کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں جنھوں نے فکری سطح پر قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ اردو کے بڑے شاعر اس لیے تسلیم کیے جاتے ہیں کہ ان کے ہاں جو فکری نظام اُبھرتے ہیں ان کی مقامی اہمیت کے ساتھ ساتھ عالم گیر اپیل بھی ہے۔ فن ترجمہ کے باعث آج ''ادب بغیر سرحد'' کی جو اصطلاح

سامنے آئی ہے وہ اس طرح کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے ترجموں کے باعث سامنے آئی ہے تاہم ترجمہ کے لیے یہ لازم ہے کہ مترجم ٹارگٹ متن کی اس روح کے قریب پہنچنے کی کوشش کرے جو اس متن کے اشاراتی لفظی بنت میں مستور ہوتی ہے۔ ترجمے میں اصل سے قریب رہنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اندھی وفاداری خوب صورتی کو یکسر زائل کر دیتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہوا کہ لفظوں کے لغوی معنی کی اپنی اہمیت ہے لیکن ایسے الفاظ بھی زبان کے ذخیرے کا حصہ ہوتے ہیں جن کے کوئی لغوی معنی نہیں ہوتے ہیں پر لفظوں کے درمیان معنوی رابطے پیدا کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ان کا استعمال ناگزیر ہے۔ اب کو تکنیکی اصطلاح میں عملی الفاظ (Functional Words) کہا جاتا ہے۔ لغوی معنی سے عدم واقفیت الفاظ کے صحیح استعمال میں مانع ہو سکتی ہے اس لیے کہ لفظوں کے ثانوی معنی لغوی معنی کے گہرے احساس سے ہی ممکن ہوتے ہیں۔ ادب کی جمالیات کی خاصیت یہی ہے کہ اس میں لفظوں کے ثانوی معنی اُبھارنے کے وافر مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ ادب میں بالخصوص جب ایک لفظ دوسرے لفظ یا لفظوں کی رفاقت میں بٹھایا جاتا ہے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ اس میں بسا اوقات مختلف معنیات کے شعبوں کے الفاظ کو ایک دوسرے کے قریب کیا جاتا ہے جس سے زبان کا Representational Character قائم نہیں رہتا ہے بلکہ ایک ایسی کائنات تخلیق ہوتی ہے جو حقیقی دنیا سے رشتہ رکھنے کے باوجود مختلف اور منفرد ہوتی ہے۔ ادب کی جمالیات کا انحصار جہاں الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارات اور دوسرے لسانی حربوں کے معنیاتی بصیرت کے ادراک سے مشروط ہے وہیں لفظوں کی صوتی اور صوری تشکیل یا صورت گری بھی ادبی جمالیات کو دو چند کر دیتی ہے۔ بہ قول

رومن یکوب سن ادبی جمالیات کا اہم مقصد ایک ایسی زبان کی تشکیل ممکن بنانا ہے جو ''ذریعہ'' نہیں بلکہ خود ''مقصد'' کا درجہ حاصل کرتی ہے۔'' A focus on the message for its own sake''۔ یہاں 'Message' کا مطلب نمائندگی (Representation) کے بجائے زبان کے تخلیقی برتاؤ سے ہے جس کو انھوں نے 'Literary Meaning' کا نام دیا ہے۔

---

۱؎ پلاسی کی لڑائی میں سراج الدولہ انگریزوں کا سخت ترین مقابلہ کیا لیکن ان کا کرنل کمانڈر میر جعفر انگریزوں سے مل گیا اور سراج الدولہ کی شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہی بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی۔ میر جعفر کو انگریزوں نے ایک بڑے عہد سے سرفراز کیا اور لارڈ کالائیو کو کافی مال و دولت ملی۔ سراج الدولہ کو بعد میں مرشد آباد سے گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔ ان کی رعایا ان سے بہت خوش تھی۔

☆☆☆